

تفسیر "سورہ البقرہ" (آیات 36 تا 40)

<?xml encoding="UTF-8">

"فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (36)."۔

اس کے بعد شیطان نے ان کا قدم پھسلا کر وہاں سے ہٹانے کا سامان کیا تو انہیں جس میں وہ تھے اس سے نکلوا دیا اور ہم نے کہا کہ اتر جاؤ تم میں ایک کا ایک دشمن ہوگا اور تمہیں زمین پر ٹھہرنے اور ایک میعاد تک فائدہ اٹھانے کا موقع ہوگا۔

۔۔۔

شیطان سے مراد وہی ابلیس ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ اس کا نام تھا یہ اس کا وصف ہے جو اب اس کی شرارت کے ظہور کے بعد اس کے لیے ہمیشہ کے واسطے ثابت ہو گیا۔ (1)
"زل" کے معنی قدم کا پھسلنا اور "أَزَلَ" کے معنی "پھسلایا" اس کے مفہوم میں یہ مضمحل ہے کہ اس عمل میں مخالفت الہی کا قصد و ارادہ نہ تھا۔ اب پھسلنے میں چونکہ ایک جگہ سے ہٹنے کا تصور شریک ہے اس لیے اس کے متعلق "عنها" کے لفظ سے ذکر کیا گیا۔ یہ ضمیر جنت کی راجع ہے۔ (2)

اس سے بھی ظاہر ہے کہ شیطان کے کہنے سے جو کچھ ضرر مترتب ہوا وہ بس جنت سے ہٹنا تھا۔ یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ وہ نہیں جس کی مخالفت ہوئی "ارشادی" تھی "نہی مولوی" نہ تھی ورنہ اس کے نتیجہ میں سب سے بڑی چیز مالک کی ناراضی بیان ہو چاہیئے تھی اور اسی نقصان و مضرت کی پھر تشریح یہ کی گئی کہ اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے شیطان ان کے نکلنے کا باعث ہو گیا۔ یہی وہ مضرت تھی جس سے بچانے کے لیے وہ ممانعت ہوئی تھی اور اس کی تکمیل اس حکم الہی سے ہو گئی کہ اترو اب زمین پر تمہیں ایک مدت رہنا اور عمر گزارنا ہوگا۔

اس کا ظاہری مفہوم اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ وہ جنت زمین پر نہ تھی۔

اس شیطان کی وسوسہ انگیزی کی پہلی ضمیریں تثنیہ کی تھیں "دونوں اس جگہ رہو" دونوں جس طرح چاہے کھاؤ پیو" دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا" نہیں تو تم دونوں ظالموں میں سے ہو گے" ان کے مخاطب آدم (ع) و حوا (ع) تھے۔ اب ابلیس کا ذکر آگیا تو تین ہو گئے اس لیے "اہبطوا" اترو اور "بعضکم لبعض عدو" تم میں ایک کا ایک دشمن ہوگا" جمع کی ضمیریں صرف ہوئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجدہ نہ کرنے کے بعد شیطان مجمع ملائکہ سے تو خارج کر دیا گیا تھا مگر امکانی طور پر عالم اعلیٰ سے نکالا نہیں گیا تھا اور اسی لیے اس جنت میں آدم و حوا (ع) تک پہنچ سکا۔ اب اس وسوسہ انگیزی کے بعد اس کا امکانی طور پر بھی وہاں سے نکالا گیا جو اُس کے لیے تو بطور سزا تھا کیونکہ وسوسہ انگیزی اس کا بطور شرارت ارادی فعل تھا اور آدم (ع) و حوا (ع) کے لیے یہ ان کے فعل کا لازمی نتیجہ تھا جسے مرتب ہونا اب ضروری تھا۔ اتنی وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم سے ثابت ہو سکتی ہیں اس کے آگے جو تفصیل روایات میں درج ہیں ان کی حقیقت مولوی عبدالماجد دریابادی کے قلم سے سنئے وہ لکھتے ہیں :

"بائبل میں ہے کہ یہ بہکانے والا سانپ کی صورت میں گیا، اس نے آکر پہلے حوا علیہا السلام کو بہکایا اور پھر

انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی ترغیب کی۔ ہمارے مفسروں نے بھی ایک طویل قصہ نقل کیا ہے جس میں شیطان، سانپ، طاؤس سب کا ذکر آتا ہے۔ یہ قصہ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے، اس سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ یہ اسلامی عقائد میں بہر حال داخل نہیں اور اسکا مآخذ قرآن و سنت نہیں بلکہ اسرائیلی روایات ہیں۔ جو اہل تفسیر زیادتی محتاط و محقق ہوئے ہیں وہ اس سے الگ ہی رہے ہیں بلکہ اس سے احتیاط ہی کی تنبیہ کی گئی ہے :

"اعلم ان هذا وامثاله مما يحب ان لا يلتفت اليه" (3)

"وقد اكثر المفسرون في نقل قصص كثيرة في قصة ادم و حواء الحية واللّه اعلم بذلك" (4)

"وقد ذكر المفسرون ههنا اخبارا اسرائيلية" (5)

علامہ بلاغی (رح) نے لکھا ہے :

"قد رويت في كيفية وصوله اليها و الوسوسة و المخاطبة بالاغواء روايات لم تصح"

شیطان آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام تک کیونکر پہنچا اور وسوسہ انگیزی کس طرح کی اور کہاں انہیں ورغلا یا ! اس سب

کے بارے میں ایسی روایتیں آئی ہیں جو پایہ صحت تک پہنچی ہوئی نہیں ہیں " (آلاء الرحمن)

**

"فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (37).

اس کے بعد آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھ لیے تو اس نے انکی توبہ قبول کر لی۔ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بہت

مہربان ہے"

؛؛؛

درخت کے قریب جانے سے ممانعت، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اگرچہ مولوی نہ تھی ارشادی تھی مگر اس قسم کا بھی خالق کی ہدایت سے عملی انحراف ایک بلند تر درجہ اطاعت کے لحاظ سے پست ضرور تھا اور اس معنی سے اسے "ترکِ اولیٰ" کہنا درست ہے اور اسی لیے وہ اگرچہ اصطلاحی گناہ نہیں جو منافی عصمت ہو مگر ایک نبی کو اس سے بلند تر درجہ سے اپنے پیچھے ثابت ہونے احساس اتنا ہی کرب اور بے چینی میں مبتلا کرتا ہے جتنا ایک واقعی گناہگار کو اسکا گناہ — بلکہ یہ گناہگار چونکہ اپنے ضمیر میں اتنی بیداری نہیں رکھتا اور اسکی نگاہ میں عظمتِ معبود کا اتنا احساس نہیں اسیے یہ اتنی تڑپ محسوس نہیں کرتا جتنا خالق کا ایک معصوم بندہ صرف کسی مستحب کے ترک ہونے بلکہ بسا اوقات اپنے ذوق و حوصلہ اور ولولہ اطاعت کے درجہ تک عبادت سے قاصر رہنے کی وجہ سے تڑپ محسوس کرتا ہے۔

اب اگر بندہ واقعی گناہگار ہوتا تو خالق کی ناراضگی نگاہِ مرحمت کو اس سے ہٹائے ہوئے ہوتی۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ خود اسکی طرف متوجہ ہو کر اسے توبہ کا کوئی ذریعہ بتائے۔

یوں عمومی طور پر عفو گناہان کے لیے دعاؤں کا وارد ہو جانا اور چیز ہے اور کسی بندہ کی طرف خصوصیت کے ساتھ نگاہِ توجہِ الہی کا مبذول ہونا اور چیز ہے۔ یہ توجہ تو خود بتاتی ہے کہ بندہ حقیقی معنی میں گناہگار

نہیں ہے صرف ذوقِ عبودیت کی بلندی سے بارگاہِ الہی میں اپنے مجرم ہونے کا تصور قائم کر کے دل میں کڑھ رہا ہے، پریشان ہے اور ایک اضطراب محسوس کر رہا ہے۔ اس لیے خداوندِ کریم کا لطفِ خصوصی اور تفضلِ امتیازی اس بندہ کی طرف متوجہ ہو کر اسکی تسلی کا سامان بہم پہنچاتا ہے، اس طرح کہ اسے خود کچھ اندازِ توبہ سکھاتا ہے کہ اچھا تم سے اگر کچھ کمی ہوئی ہے جس سے تم اپنے کو مجرم محسوس کرتے ہو تو یہ میرا بتایا ہوا اندازِ اختیار کرو پھر اس کے بعد جو کمی تم سے ہوئی تھی وہ کالعدم ہو جائیگی۔ اسی کو کہتے ہیں توبہ کا قبول ہو جانا۔

اب اس توجہ باری کو دیکھ کر اور اس ہدایتِ ربانی پر عمل کر کے اس عبدِ الہی کو گو نہ سکون محسوس ہوتا ہے اور یہ خالق کی عنایت اس کے زخم پر پھاہا رکھ کر اب آئندہ زندگی میں ایک بلند تر معیارِ اطاعت و عبادت کی عملی پابندی کے لیے اسے ذوق و شوق اور نیا حوصلہ بخشنے میں مددگار ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں نہ حقیقت میں گناہ تھا اور نہ گناہ سے توبہ اور اسکی قبولیت۔ بلکہ صرف وہ آدم علیہ السلام کی جلالت کے لحاظ سے ایک بلند تر مرتبہ سے پیچھے رہنا تھا اور اسی کے شدتِ احساس کے ساتھ آئندہ سے اس سے باز رہنے کا عزم توبہ تھا اور خالق کی برف سے ان کو اپنی پوری مہربانی و عنایت کے استحقاق کی اطمینان دہانی قبولِ توبہ ہے۔

اس سے سیاقِ کلامِ ربانی میں ایک طرح کے اختلافِ اسلوب کا راز معلوم ہوگا وہ یہ کہ ممانعت جو درخت کے پاس جانے سے ہوئی تھی اس میں آدم (ع) اور حوا (ع) دونوں شریک تھے اور وہاں صیغے تثنیہ کے صرف ہوئے تھے مگر اس کے بعد توبہ کے لیے الفاظ سیکھنے سکھانے اور اس کے بعد توبہ کی قبولیت کے محل پر صرف آدم علیہ السلام کا نام لیا گیا اور مفرد ہی صیغے صرف ہوئے، اسکا کیا سبب ہے؟ سبب یہی ہے کہ اگر وہ قانونی گناہ ہوتا تو قانون چونکہ عام ہوتا ہے اس لیے جرم مشترک ہوتا اور توبہ اور اسکی قبولیت دونوں کے لیے ضروری ہوتی مگر چونکہ وہ گناہ تھا ہی نہیں بلکہ ترکِ اولیٰ تھا صرف آدم علیہ السلام کی جلالتِ قدر کے لحاظ سے اور قبولِ توبہ اسی احساس کے مقابلہ میں تسلی دہانی تھی، اس لیے ان چیزوں کا تعلق صرف آدم علیہ السلام سے رہا۔ ترکِ اولیٰ جنابِ آدم علیہ السلام کا تھا۔ اس پر اضطراب اور بے چینی اور جیسا کہ روایات میں ہے شدتِ گریہ، یہ سب آدم علیہ السلام کے لیے ہوا اور اسی لیے الفاظِ توبہ سکھانے کی ضرورت آدم (ع) کو ہوئی اور قبولِ توبہ کی تصریح بھی انکی نسبت ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ جب آدم (ع) نے الفاظ سیکھ لیے تو حوا (ع) کو بھی سکھا دیئے ہوں اور دونوں نے زبان پر جاری کر لیے ہوں، جیسا کہ دوسری جگہ ہے :

"قال ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين" (الاعراف#23)

یا ہم کہیں کہ حوا (ع) بھی طبقہ خواتین میں کسی خاص درجہ رہنمائی پر فائز تھیں۔ اس لیے وہ کسی حد تک ان کے لیے بھی ترکِ اولیٰ تھا اور اس لیے انہیں اتنی بے چینی نہ سہی جو حضرت آدم علیہ السلام کو تھی پھر بھی انفعال ہوا اور انہوں نے الفاظِ توبہ کے ادا کرنے میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شرکت کی۔

**

"قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَاَمَّا يَتَّبِعُكَ مِنْ هَدًى فَمَنْ تَبِعَ هَدًى فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (38)۔

ہم نے کہا تم سب اس سے اتر جاؤ۔ اس کے بعد اگر میری طرف سے تمہاری جانب کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے

کی ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ انہیں رنج پہنچے گا"

؛؛؛

قبولِ توبہ کے بعد پھر بھی اُترنے کا حکم ہونا اسکی دلیل قوی ہے کہ زمین پر اتارا جانا آدم و حوا علیہما السلام کے لیے بطور سزائے جرم نہ تھا ورنہ قبولِ توبہ کا اعلان ہوچکنے کے بعد پھر سزا کے برقرار رہنے کے کوئی معنی نہیں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ سزا نہیں تھی بلکہ درخت کے قریب جانے کا لازمی اثر تھا جس کا مرتب ہونا بہر حال ضروری تھا اور واقعہ تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام اسی زمین کی خاطر ہی پیدا ہوئے تھے جیسا کہ خلقت سے پہلے ہی ملائکہ کو خبر یہی دی گئی تھی کہ

"انی جاعل فی الارض خلیفۃ"

میں زمین میں جانشین قرار دینے والا ہوں"

درخت سے تناول کر لینا زمین پر بھیجے جانے کا فوری سبب ہو گیا اور اگر یہ سبب وقوع میں نہ آتا تو کچھ مدت تک اور جنت میں رہنے دیئے جاتے مگر آخر میں پھر زمین پر بھیجے جاتے جس سے ان کے مقصدِ خلقت کی تکمیل بہر حال وابستہ تھی۔

اب "قلنا اہبطوا" کے بعد جو خطاب ہے وہ آدم و حوا علیہما السلام کو سامنے رکھ کر اس پوری نوع سے ہے جو انکی ذریت میں سے اس معمورہ ارض کو نسلًا بعد نسل آباد کریگی اور اب اس حکم سے قوانینِ تکلیفیہ کا آغاز ہو رہا ہے جس کے ساتھ جزاء و سزا کا وعدہ و وعید بھی موجود ہے یعنی نوعِ انسانی کے سامنے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی زبانی جو تعلیمات پہنچتی رہیں گی انکی جو اطاعت کریں گے انہیں نجات حاصل ہوگی۔

نجات کے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ انہیں خوف اور رنج درپیش نہ ہوگا۔ اس کا خوف و رنج دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ اس کے بالمقابل جو کفر اختیار کریں گے ان کے ذکر میں آئندہ آیت میں آگ میں ہمیشہ رہنے کا ذکر ہے۔ وہ یقیناً آخرت سے متعلق ہے۔ اسی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ خوف اور رنج کی نفی جو اہل ایمان سے کی گئی ہے یہ بھی آخرت سے متعلق ہے ورنہ دنیا میں تو صاحبانِ ایمان اکثر و بیشتر خوف و رنج میں مبتلا رہتے ہیں۔

**

"وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (39)۔"

اور جو کفر اختیار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے یہ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے"

؛؛؛

"نار" کے معنی تو مطلق آگ کے ہیں مگر اس پر "ال" عہد خارجی کا ہے جس سے اشارہ اس خاص آگ کی طرف ہوتا ہے جو آخرت کے عذاب کے لیے الہی مخبروں نے بتائی ہے جسے اصطلاحاً "جہنم" کہا جاتا ہے اور اسکا ترجمہ "دوزخ" کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ مولوی عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے کہ "اس آگ کا ذکر سابقہ کتب سماویہ میں بھی کہیں کہیں پایا

جاتا ہے جیسے :

"فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راست بازوں سے جدا کردیں گے اور انہیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے وہاں رونا اور دانتوں کا پیسنا ہوگا" (متی 13:49 و 50)

اے ملعونو! میرے سامنے سے اس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے تابعین کے لیے تیار کی گئی ہے اور یہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے۔ (متی 25:41 و 46)

-جہنم میں ڈالا جائے جہاں اس کا کیڑا نہیں مارتا اور آگ نہیں بجھتی۔ (مرقس 9:48)

یہی دونوں باتیں کہ اس آگ میں داخل ہونے والے کے لیے پھر موت نہیں جو اس عذاب کو ختم کردے اور نہ وہ آگ خود بجھنے والی ہے کہ اس سے کبھی نجات حاصل ہوسکے قرآن کریم میں "خالدون" کے لفظ سے ادا کی گئی ہیں"

یہ "خلود" جنت اور جہنم دونوں کا وصف ہے۔ وہاں کی نعمت ختم ہونیوالی نہیں اور یہاں کا عذاب۔ ہاں جہنم سے کچھ اشخاص کو جنکی معصیت حدِ کفر تک نہیں پہنچتی ہے میعادِ سزا بھی دی جائیگی اور بقدرِ گناہ اس سزا کے ختم ہونے کے بعد وہ بہشت میں جو انکی اصلی جگہ ہے ہمیشہ کے لیے داخل کردیئے جائیں گے یہ لوگ دراصل "اصحاب النار" کے لفظ کے مستحق ہیں ہی نہیں کیونکہ یہ عذاب ان کے لیے انکی دنیا کی بہت سی تکلیفوں کی طرح ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ انجامِ آخر کے اعتبار سے انہیں "اصحاب الجنة" ہی سمجھنا درست ہے اور اسی لیے کفر اور تکذیب کرنے والوں کے ذکر کے ساتھ "اولئک اصحاب النار" کا لفظ کہا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوں وقتی طور پر عذابِ جہنم سے چاہے کچھ اور لوگوں کو بھی سزایاب بنادیا جائے مگر اصلی تعلق رکھنے والے دوزخ کے ساتھ یہی لوگ ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر کفر اختیار اور آیاتِ الہیہ کی تکذیب کو شعار بنائے رکھا۔

**

"يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآءِیْل اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُواْ بِعَهْدِيْ اُوْفٍ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اٰیٰی فَاَرْهَبُوْنَ (40)۔"

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا اور مجھ سے جو معاہدہ ہے اسے پورا کرو تو میں تم سے

معاہدہ پورا کروں اور اسکے بعد مجھ سے ڈرتے رہو!؛؛؛

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اسحق علیہ السلام کے بعد ان کے فرزند یعقوب علیہ السلام ہوئے جو "اسرائیل" کہلائے۔ عبرانی میں ایل کی لفظ اللہ کے لیے آتا ہے اور اسی وجہ سے ملائکہ کے ناموں میں یہ لفظ آیا کرتا ہے جیسے جبرائیل (ع)، عزرائیل (ع)، اسرافیل (ع) وغیرہ۔ اس سے اس طرح کی اضافت نکلتی ہے جیسے عبداللہ، قدرۃ اللہ وغیرہ۔ اسراء کے معنی 'قوة' کے تھے اور اس طرح اسرائیل کے معنی ہوئے 'اللہ کی قوت' اس لقب کے ساتھ انکا تعارف صرف بطور نسبت اظہارِ شرف کے لیے ہوسکتا ہے جیسے آدم علیہ السلام کے لیے 'صفی اللہ'، شیث علیہ السلام کے لیے 'ہیبة اللہ'، نوح علیہ السلام کے لیے 'نجی اللہ' وغیرہ کے القاب۔ لیکن اُس لقب کے ساتھ ملقب ہونے کی تقریب کے طور پر مروجہ توریت میں ایک خرافاتی حکایت درج کی گئی ہے جس میں یعقوب علیہ السلام کا خدا کے ساتھ کشتی لڑنا مذکور ہے۔ یہ حکایت بالکل بے بنیاد اور یہود کی اختراع کردہ ہے جو جلالِ الہی کے بالکل خلاف ہے۔

بنی اسرائیل صدیوں تک دنیا میں بڑے عروج کی منزل پر رہے۔ انہیں اللہ نے اپنی جس نعمت سے نوازا اسکی ذرا تفصیل دوسری جگہ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی درج ہے :

"واذ قال موسى لقومه يقوم اذكروا نعمة الله عليكم اذ جعل فيكم انبياء و جعلكم ملوكا و اتاكم مالم يؤت احدا من العالمين"

اور جب موسى نے اپنی قوم سے کہا: قوم والو! یاد کرو اللہ کی اُس نعمت کو جو تم پر ہے جبکہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا" (المائدہ#20)

ان پر خالق نے اور جو خصوصی فضل و احسان کے مظاہرے فرمائے ہیں اور ان کے ساتھ جو جو رعایتیں ہوئی ہیں انکا ذکر اسی سورہ بقرہ میں بہت دور تک جستہ جستہ آتا رہیگا مگر تمام نعمتوں ، ان تمام احسانوں اور رعایتوں کے باوجود اس قوم کی اکثریت برابر خالق کی نافرمانی کرتی رہی اور چند دفعہ ایسا ہوا کہ من حیث القوم سب کے سب مرتد ہو گئے۔ اسکا نتیجہ یہ تھا کہ باوجودیکہ صدہا برس تک انبیاء اس قوم میں ہوتے رہے آخر میں نبوت کی نعمت اس سے سلب ہو گئی اور آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم جو مبعوث ہوئے وہ آلِ ابراہیم کی دوسری شاخ یعنی حضرت اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے۔ یہ چیز بنی اسرائیل کے لیے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔

زمانہ نزولِ قرآن میں یہ بنی اسرائیل دو مذہبوں میں تقسیم تھے۔ ایک یہود جو حضرت موسیٰ علیہ السلام تک مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قائل نہ تھے۔ دوسرے نصاریٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسالت کی منزل سے گزار کر خدا یا خدا کے بیٹے کی حد تک مانتے تھے۔ اسلام سے ان دونوں قوموں کو علاوہ مذہبی اختلافات کے یہ جذباتی تعصب بھی تھا کہ یہ رسول ہماری قوم سے نہیں آیا ہے بلکہ بنی اسمعیل (ع) سے آیا ہے جو روایاتِ قدیمہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس آیت میں قرآنِ مجید نے اسی کا جواب دیا ہے اور کہا ہے کہ ذرا میرے احسانات کو یاد کرو کہ تمہارے ساتھ میں نے کیا کیا حسنِ سلوک کیا۔ اس کے ساتھ تم نے ہمیشہ کفرانِ نعمت اختیار کیا۔ پھر اب اگر ایک دوسری قوم کی نوازشِ نعمت و فضلِ نبوت کے ساتھ ہو گئی تو اس پر چراغ پا کیوں ہوتے ہو؟

پھر یہ کہ خود تمہارے انبیاء نے جنہیں تم جانتے ہو پہلے ہی میری طرف سے تم کو یہ خبر پہنچادی تھی کہ آخر زمانہ میں میں اولادِ اسمعیل (ع) سے ایک نبی پیدا کرونگا۔ اب وہ نبی آیا ہے تو مجھ سے اپنے اس عہد کو پورا کرو کہ اسکی اطاعت کرو گے پھر مجھ سے اس کے بعد اپنے لیے بھی نوازش و کرام کے عہد کو پورا کرنے کے متوقع ہونا۔ اور جب ایسا نہیں ہے تم کفرانِ نعمت کرتے رہے اب عہد شکنی کر رہے ہو تو پھر مجھ سے تم کسی خوشگوار نتیجہ کا مطالبہ کیوں کرتے ہو۔ تمہیں تو اب مجھ سے ڈرتے ہی رہنا چاہیئے۔

اس سے ایک عام اصول مستفاد ہوتا ہے کہ اگر انسان خدا کے ساتھ اپنے فریضہ کی تکمیل نہیں کرتا تو اسے حق بھی نہیں کہ وہ اللہ سے اُس کے کسی وعدے کی تکمیل کا مطالبہ کرے۔ اسی لیے امام جعفر الصادق علیہ السلام نے اس آیت کو پیش فرمایا اُس شخص کے جواب میں جس نے پوچھا تھا کہ خدا نے قبولیتِ دعا کا وعدہ کیا ہے پھر ہم دعائیں کرتے ہیں تو وہ قبول کیوں نہیں ہوتیں۔ آپ (ع) نے فرمایا :

"انکم لا تفون اللہ بعہدہ فانہ تعالیٰ بقول اوفوا بعہدی اوف بعہدکم و اللہ لو وفیتم للہ سبحانہ لو فی لکم" (صافی)

(یعنی) تم اللہ سے وہ عہد جو اس نے تم سے لیا ہے پورا نہیں کرتے۔ خود اس نے ارشاد کیا ہے کہ تم میرے عہد کو پورا کرو

میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اگر تم اللہ سے وعدہ و فائی کرتے تو وہ بھی تم سے ایفاءے عہد کرتا" (6)

- (1). الشيطان فعال من شطن اى بعد سمى به لبعده عن الخير عن الرحمة (بغوى)
- (2). ازلهما عن الجنة بمعنى — ابعدهما منها فان الازلال والازلاق يقتضى زوال الزال عن موضوع البتة (ابوالسعود)
- (3). معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ اور ایسی روایتیں وہ ہیں جنکی طرف توجہ نہ کرنا واجب ہے (کبیر)
- (4). مفسرین نے بکثرت قصے آدم (ع) اور حوا (ع) اور سانپ کے بارے میں درج کیے ہیں اور حقیقت حال سے بس اللہ واقف ہے (بحر)
- (5). مفسرین نے یہاں بہت سی اسرائیلی روایتیں درج کردی ہیں (ابن کثیر)
- (6). ويوحذمن الاية قاعدة كلية وهى ان من لم يف بعهدالله فيما اخذه من الدين والشرية فهو بنفسه قد عهدالله معه و خرج عن كونه اهلا لما وعده من اللطف والرحمة واستجابة الدعاء. (البلاغی)